ڈاکٹر محمد امجد عابد
اُستاد شعبہ اردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور
عظمیٰ یٰسین
ریسرچ اسکالر(پی ایچ۔ڈی ،اُردو)اورینٹل کالج، یونیورسٹی آف دی پنجاب، لاہور

اُردو شعرا کے تصوراتِ مرگ

(میر ، غالب ، حالی اور اکبر کے خصوصی حوالے سے)

Many thinkers and ideologists have expressed their distinctive views regarding death. This is very important topic carrying a universal theoratical importance. That is why Urdu poets have dealt with this topic in their various generas. Many poets have stated death as a mean of reflection of life. This dissertation highlights the concept of death as viewed by Meer, Hali, Ghalib and Akbar Ilah Abadi. Moreover these poets while elaborating the vastness of life and its contemporary possibilities have declared death as such an experience which works as a root of life.

بنی نوع انسان کی معاشی ، سیاسی اور تہذیبی زندگی فلسفہ اخلاق سے مربوط ہے اوریہ فلسفہ زندگی اورموت کے تصوّر کی بنیاد قائم کر تا ہے۔زندگی اور موت کا تصوّر جملہ شعبہ ہائے حیاتِ انسانی کو محیط ہے۔چنانچہ کسی بھی تہذیب و معاشرت کے مطالعے کا ایک امکانی اسلوب یہ بھی ہے کہ اُس کے یہاں زندگی اور موت کے تصورات کے نسبتی پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جائے۔فلسفہ اخلاق ،خواہ اس کا تعلق مذہب سے ہو یا وہ فلسفیانہ نظریات پراستوار ہو، اِس ایک سوال سے منسلک ہے کہ زندگی اور موت سے متعلق اس مذہب یا نظریے کی نوعیت کیا ہے؟ بیشتر مذاہب حیات بعد الموت کے ضمن میں تسلسلِ حیات کے نظریے پر قائم ہیں۔

اس ضمن میں ابتدائے آفرینش سے آج تک موت کے بعد انفرادی بقا کی شدید خواہش ہر انسان میں موجود رہی ہے۔قدیم تہذیبوں اور جملہ الہامی اور غیر الہامی مذاہب میں " موت " کے ساتھ

وابستگی کے تصوّر کی مختلف صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ اس اعتبار سے حیات بعد الموت کا تصور ہر معاشرے، مذہب اور تمدّن کی رگوں میں خون کی مانند سرایت کیے ہوئے ہے۔

موت کے بعد کی زندگی پر غور و فکر اور یہ اعتقاد کہ وہ موجودہ معاشرتی زندگی سے بہتر ہو گی، انسان کو ایک بڑے فلسفہ حیات سے روشناس کرواتا ہے اور حیاتِ موجود کو اس کی تمام تر کمزوریوں کے ساتھ خدائی نظام کاایک حصہ مان کر، قبول کر نے پر آمادہ بھی کر تا ہے۔موت کے بارے میں مختلف تصوّرات دنیا کے ہر ادب میں پائے جاتے ہیں۔ خصوصاً شاعری میں، جو اپنے مزاج اور کیفیت و کمیّت کے حوالے سے فکری اور جذباتی دونوں سطحوں پر اس موضوع سے ایک خاص تعلق رکھتی ہے۔ اردو شاعری نے موت کے تصور کو جس وسیع اور ہمہ گیر پیرائے میں قبول کیا ہے اس کی مثالیں دیگر زبانوں کی شاعری میں بہت کم دیکھنے میں آ تی ہیں۔

دکن میں فارسی روایت کے زیرِ اثر جو مضامین شاعری خصوصاً اردو غزل کا موضوع بنے ان میں عشق و محبت اور تصوّف کا غلبہ رہا۔اس عہد میں انہی دو بنیادی حوالوں سے زندگی اور موت کو دیکھنے کا رجحان ملتا ہے۔شمالی ہند کی اُردو غزل میں زندگی کے بارے میں نقطہ نظر دلی جذبات و احساسات کی بنیاد پر قائم کیا گیا۔بہارِ عشق کو تصوّف اور روح کی بے قراری سے وابستہ کیا گیا اور موت کے بارے میں بھی اسی انداز سے سوچا گیا۔میر نے مرگ کے تصور کو نفسیاتی، اخلاقی اور فلسفیانہ رنگ ِبقا کے تصورات کو حسن و عشق کے باہمی تعلق سے جوڑا۔درد نے تصوّف کے زیرِ اثر زندگی و موت کامشاہدہ کیا۔غالب نے زندگی کو تعمیر اور موت کو تعمیرِ نو سے تعبیر کیا۔

بیسویں صدی کے بدلتے ہوئے تقاضوں میں زندگی کے لیے کسی ایک نقطہ نظر کی تلاش اُردو غزل کے شعرا کا ایک اہم مسئلہ رہی ہے۔زندگی کے حقائق کے ادراک پر توجہ دی گئی۔کسی ایک نظریہ حیات پر عمل پیرا ہو کر امت مسلمہ کے احیا کی بحالی کی کوششوں کا آغاز ہوا۔تصوّف سے ہٹ کر بھی زندگی کو دیکھنے کا شعور ابھرنے لگا۔اس صورت حال کو خالدعلوی اس انداز سے دیکھتے ہیں:

> ”اس عہد میں شاعروں نے نہ صرف زندگی کو قریب سے دیکھنا شروع کیا بلکہ زندگی کیسی ہونی چاہیے اس پہلو پر بھی غور و خوض کیا۔اسی لیے بیشتر

غزل گو شعرا کے یہاں زندگی کے فانی ہونے کا احساس زندگی کو بسر کرنے اور برتنے کے احساس کی نسبتاً بہت کم ہو گیا۔" [۱]

حالی نے شاعری سے اصلاح اور اکبر نے اجتہاد کا کام لیا۔میر نے زندگی کی کش مکش کے مختلف پہلو پیش کیے اورزندگی اور موت کو ایک نئے زاویے سے دیکھا۔ڈاکٹر صائمہ شمس لکھتی ہیں :

"اس عہد میں زندگی کے بارے میں نقطہ نظر دِلی جذبات و احساسات کی بنیاد پر قائم کیا گیا۔ یہاں عشق کو تصوّف اور روح کی بے قراری سے وابستہ کیا گیااور موت کے بارے میں بھی اسی انداز سے سوچا گیا۔سیاسی اور تہذیبی زندگی کے بنتے اور بگڑے دائرے اس عہد کی شاعری کا خاص عنوان ہے۔ میرنے مرگ و حیات کے تصور کو نفسیاتی، اخلاقی اور فلسفیانہ رنگ و آہنگ عطا کیا۔" [۲]

ذیل میں چند اہم شعراءکے یہاں تصور مرگ جس انداز میں نمایاں ہوتا ہے اس کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

میر تقی میر (۱۷۲۲ء- ۱۸۱۰ء)

میر کی زندگی کی طرح اس کی ناکامیوں کی فہرست بھی خاصی طویل ہے دس برس کی عمر میں چچا اور گیارہ برس کی عمر میں والد کا انتقال ، نو عمری میں فکرِ معاش ، خان آرزو کے گھر سے امیر خاں انجام کے ہاں منتقلی، احمد شاہ کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں، عالم گیر ثانی کا قتل، احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان پانی پت کی تیسری جنگ، فاقہ کشی، بیٹے کا چھپّرتلے دبنا، شاہوں کا گدا بننا، وارن ہیسٹینگز کی لکھنو میں آمد اور اودھ کی بیگمات پر مظالم، عشق اور خلل اعصاب خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان تمام واقعات و حادثات نے میر کی ذات، زندگی اور ماحول میں ایک کشمکش پیدا کی، جس کا اظہار میر نے بہ کثرت کیا ہے۔ تاہم اس نے اس کشمکش کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ سینہ سپر ہو کر ضبط ، درد مندی اور امید سے اس چار دن کے جینے کو غنیمت جانا اور خانہ ویرانی میں خانہ سازی کا ہنر آزمایا۔

شکستگی اور شکستہ دلی میر کو اپنے و الد سے ورثہ میں ملی تھی۔جو ہر وقت رو تے رہتے تھے اور بقول میر ”آنکھیں نم حال در ھم“ رہتا تھا۔پھر میر کے سیا سی و سماجی حالات نے بھی میر کے ذہن اور مزاج پر خاصا اثر ڈالا۔بقول نثار احمد فاروقی:

> ”جس طرح میر کی زندگی اس کے عہد کے سیاسی خلفشار اور سما جی مظاہر میں گم ہو گئی ہے، اسی طرح یہ دور اُن کی شاعری کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔خود میر کو بھی اس کا احساس ہو گیا ہے کہ وہ ”دل اور دلی“ کے مر ثیے لکھتا ہے۔“(۳)

میر کی اُردو غزل میں ،زندگی کی نا پائیداری کو تسلیم کر نے کا جو رجحان ملتا ہے اس میں دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ رہنے کی خواہش کا اظہار بھی ہے۔ایک طرح سے یہ نا پائیداری زندگی کا اصل حُسن ہے جو زندگی اور اس کی سرگرمیوں کو رواں و متحرک رکھتا ہے آخرت کا خیال ، دنیوی زندگی کو سنوارنے پر آمادہ کیے رکھتا ہے ا ور وقت قلیل کے پیش نظر زندگی سے فائدہ اٹھا نے کے زیادہ سے زیادہ مواقع تلاش کر نے کی رغبت پیدا ہو تی ہے اور بقول میر تھوڑے سے پانی میں بھی حیات انسانی کا میاب پھر تا اور چلتا رہتا ہے۔ایک لحاظ سے میر کے ہاں جس قدر زندگی کی بے ثباتی کا احساس ملتا ہے ، اسی شدت کے ساتھ زندگی سے وابستگی بھی ملتی ہے۔

زندگی کے جبر و قہر میں میر نے زندگی کو ایک سہارے کے طور پر قبول کیا ہے۔تسلیم و رضا، صبر و توکّل کے ساتھ میر دوا اور دعا کا بھی قائل ہے۔زندگی کی فتح ہو یا شکست ، میر کے ہاں تصوّرِ تقدیر کے ذریعے زندگی کے حقائق کو بھگتنے اور بر تنے کا رجحان نمایاں ہے۔

ان پر ایک ایسا دور بھی آیا جب ظاہری اسباب لٹ گئے۔خانقاہیں نہ رہیں اور وہ افراد جو میر کی زندگی کا آسرا تھے ، بذاتِ خود تقدیر کے جبر کا شکار ہو گئے۔نجم الدولہ کے قتل کے بعد میر کا شکست خوردہ لشکر کے ساتھ دلی آنا، میر کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔امرا کی محفلوں میں با عزت زندگی کا حوالہ بننے والا میرا ب ایک متوکّل درویش بن چکا تھا۔اس کا تصورِ تقدیر انسانی عظمت کا حامل بھی ہے اور خدا سے وابستگی کا اظہار بھی۔میر نے ”ذکر میر“ میں خدا کے دائرہ اختیار کو تسلیم کر تے

ہوئے عاجزانہ امید میں اپنی بندگی اور اس کی رحمت کا اقرار یوں کیا ہے:"۔۔۔اگر چہ فلک کج رفتار مجھ سے کج بازی کر تا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ وہ بے آبرو نہ ہونے دے گا۔"(۴)
پھر یوں کہتے ہیں :

غم فوت سے بندے آزاد رہ
خدا ہے تو کیا غم ہے، دلشاد رہ (۵)

آخر تو ہے خدا بھی تو اے میاں جہاں میں
بندے کے کام کچھ کیا موقوف ہیں تمہی پر (۶)

چاہتا ہے جب مسبب آپ ہی ہو تا ہے سبب
دخل اس عالم میں کیا ہے عالم اسباب کو (۷)

خدا سے تعلق کی اس استواری کو میر نے اپنی طاقت بنایا، اپنے نفس کی تربیت کا ذریعہ اور زندگی کی بصیرت کاوسیلہ بھی بنایا۔میر کا فلسفہ تقدیر، فطرت سے ہم آہنگی کی ایک صورت ہے جو زندگی کی ناکامیوں میں اس کلبیت سے بچائے رکھتی ہے۔جس کے اثرات عجمی تصوّف میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ میر کے ہاں موت کا ایک تصور وہ بھی ہے جس میں موت کو ایک فطری عمل قرار دے کر زر داروں کو عزت دلائی ہے اور ایک وہ ، جہاں مرگ، زندگی کی ایک ارتقائی شکل میں ظاہر ہو تی ہے:

مرگ ، اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر (۸)

اس منزل دلکش کو منزل نہ سمجھیے گا
خاطر میں رہے یاں وے در پیش سفر بھی ہے (۹)

فکر میں مرگ کے ہوں سر در پیش
مرحلے آئے کس قدر در پیش (۱۰)

میر کے تصوّرِ مرگ پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر سید عبد اللہ لکھتے ہیں:

"ما بعد الموت کے متعلق صوفیوں کے ہاں بھی اس طرح کے تصوّرات مل جاتے ہیں مگر میر کے یہ تصوّرات جمالی اور رجائی صوفیوں سے ان معنی میں

مختلف ہیں کہ ان کے نزدیک زندگی کے اندر بھی تلخی کااحساس نہیں اور مر
نے کے بعد تو راحت ہی راحت ہے۔" (۱۱)

عمومی اعتبار سے میر کے ہاں زندگی کی الم ناکی، زندگی کی بے ثبا تی کے احساس سے پیدا ہو تی ہے چنانچہ اپنے دوسرے ممتاز معاصرین کی طرح عالم کی بے ثباتی بھی میر کا ایک محبوب موضوع ہے۔زندگی اور دنیا کی بے ثبا تی کا احساس ان کے المیہ احساس کی شدت میں ہر گھڑی اضافہ کر تا ہے۔ زندگی کا اختصار اور اس کا انجام موت کبھی میر کو حیرت میں مبتلا کر تا ہے، کبھی سوال کر نے پر اکسا تا ہے، کبھی تاسف اور یا سیت کے جذبات بیدار کر تا ہے ، کبھی بیدلی اور افسر دگی میں مبتلا کر تا ہے، کبھی رونے اور آنسو بہا نے پر آمادہ کر تا ہے اور کبھی اسے ایک ناگزیر حقیقت کے طور پر قبول کر نے بلکہ اس کی مثبت عقلی توجیہات تلاش کر نے کا سبب بھی بنتا ہے۔بقول میر:

سچ ہے راحت تو بعد مرنے کے
پر بڑا واقعہ یہ حائل ہے (۱۲)

موت، میر کے لیے زندگی کا خاتمہ نہیں اس لیے جسم و جاں کی اس عارضی شکست و ریخت کے بعد بھی، میر فنا میں ایک بالیدگی کا تصوّر پیش کر تا ہے۔بقول میر:

گیا جہاں سے خورشید سا اگرچہ میر
ولیک مجلس دنیا میں اس کی جا ہے گرم (۱۳)

منصور کی نظر تھی جو دار کی طرف سو
پھل وہ درخت لایا آخر سربریدہ (۱۴)

ان تمام حوالوں میں میر نے مختلف صورتوں اور مثالوں کے ذریعے موت کو زندگی ہی کی نمو اور نشو و نما کا نام دیا ہے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب (۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء)

غالب دنیا کو فانی خیال کر تے ہیں ا ور اس بات کو بھی شدت سے محسوس کر تے ہیں کہ انسان فطرت کے قانون سے بالا تر نہیں۔وہ جانتے ہیں کہ یہ عمر ایک سفر میں ہے کیا معلوم کب یہ سفر ختم ہو جائے۔غالب جس طرح زندگی کا گہرا ادراک رکھتے ہیں اسی طرح موت کا بھی پختہ شعور رکھتے ہیں۔بلکہ ان کے یہاں بار بار موت کی خواہش کا اظہار بھی ملتا ہے۔اس سے بعض اوقات یہ احساس پیدا ہو تا ہے کہ غالب شاید زندگی کی مشکلات کا سامنا کر نے سے گریزاں ہیں اور ان سے فرار اختیار کر کے موت کی جائے پناہ میں دائمی سکون حاصل کر نا چاہتے ہیں۔

ذرا غور کیجیے توبچپن کے ایک مختصر دور کے سوا غالب کی ساری زندگی آرزووں کی شکستگی اور تمناوں کی ناآسودگی کی ایک طویل داستان محسوس ہو تی ہے۔اس کے باوجود غالب کے کلام میں جس دل دوز کیفیت کا عکس نظر آتا ہے وہ مشکلات سے فرار نہیں بلکہ لٹتی ہوئی بساط کا ایک نوحہ ہے۔غالب کے ہاں زندگی ، غم سے عبارت ہے مگر زندگی بذاتِ خود قابلِ قدر ہے۔زمان و مکان کی قیود کے ساتھ بھی غالب کے لیے زندگی اہم ترین ہے۔غالب کے شخصی ارتقا میں جذباتی زندگی کے کچھ سانحے قابلِ ذکر ہیں۔محبوب کی نا گہانی موت، ۱۸۴۷ءمیں قمار بازی کے الزام میں جیل یاترا، ۱۸۲۶ءتا ۱۸۴۴ءتک پنشن کی بحالی کی ناکام کوششیں ،اور ۱۸۵۷ءمیں انسانی جانوں کا ضیاع اور قیامت کا منظر انہیں در پیش رہا۔یہی وجہ ہے کہ افسر دگی سے مفاہمت ہی غالب کا تصورِ حیات ہے۔اس تصوّر کو پرو فیسر سمیع اللہ قریشی ان الفاظ میں بیان کر تے ہیں:

> "ادبیات عالیہ کی روح افسر دگی ہی کی مر ہون منت ہے، مسرت بے شک فن کار کے نقلی جذبات کو بہت جلد انگیخت کر سکتی ہے لیکن اعلیٰ ترین جذبوں اور بلند حیات کی بیداری کا تعلق فقط افسر دگی ہی سے ہے۔" (۱۵)

اسی لیے غالب نے زندگی کو سمجھنے اور بر تنے کے لیے جس دانائی اور حکمت سے کام لیا اس کی اصل روح شمع کے ہر رنگ میں جلتے رہنے میں ہے۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک (۱۶)
سر گشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے (۱۷)
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی (۱۸)
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے (۱۹)
غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط
اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے (۲۰)

غالب موت کی آواز پر مرنے والوں میں سے ہیں۔ ان کے لیے شمشیر کا عریاں ہو نا عید نظارہ ہے۔ وہ اپنے ساتھ تیغ و کفن باندھ کر ہر وقت مرنے کے لیے تیار ہیں تاکہ مرگ بھی کوئی عذر پیش نہ کر سکے۔ وہ تلوار کو دیکھ کر گردن جھکا دینے والوں میں سے نہیں۔ بقول سید وحید الدین :

"غالب کی آرزو جہتی ہے۔ موت کی وہ آرزو کرتا ہے آلامِ حیات سے تنگ آکر اور ساتھ ہی بے کسی کی انتہا یہ ہے کہ موت ہی کا ایک سہارا رہ گیا تھا جو غم دنیا سے نجات دلا سکے لیکن وہ اُمید ہی جس کا انحصار موت پر تھا جو اب دے دے تو خیالِ مرگ سے بھی تسکین ممکن نہیں "(۲۱)

غالب کہتے ہیں :

نظر میں ہے ہماری جادہ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا (۲۲)
فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن کا (۲۳)

بیضہ آسا، تنگ بال و پر ہے کنج قفس
از سر نو زندگی ہو، گر رہا ہو جایئے (۲۴)

گویا غالب کے لیے موت ، زندگی کی تنگ دامنی سے رہا ہو کر ایک نئی زندگی کا نقطہ آغاز ہے۔اسی لیے غالب موت کو زندگی کے لیے خطرہ نہیں بلکہ زندگی کی طرح ایک مثبت قدر ہی سمجھتے ہیں۔انیسویں صدی کے ماحول میں غالب کے لیے موت کی آرزو ہندوستانیوں کے ساتھ مرغ اسیر کی رہائی بھی ہے اور اپنی آگ میں جل کر ایک نئی زندگی پانے کا اعلان بھی۔میاں محمد رفیق خاور لکھتے ہیں:

"درون خود سفر کن ، مرگ بہ شکلِ حیات ہے اور برون خود سفر کن زندگی کی طرف سے موت کو دعوت جنگ ، غالب زندگی کا پر چار نہیں کر تا بلکہ خود عین حیات ہے اور اپنے ا ثر سے دوسروں میں بھی زندگی پیدا کر تا ہے"(۲۵)

غالب جانتے تھے کہ زندگی میں موت کا کھٹکا لگا رہتا ہے اور انسان موت کے بعد ایک نئی زندگی پا سکتا ہے مگر موت سے بچ نہیں سکتا۔اس لیے غالب موت سے خائف نہیں۔پاسکل کے نظریے کے مطابق انسان ، واحد جاندار ہے جو یہ بھی جانتا ہے کہ موت اس کی زندگی کا لازمی انجام ہے۔حاتم علی بیگ مہر کے نام لکھے گئے ایک خط میں غالب نے بھی لکھا کہ کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے۔نواب یوسف مرزا کے نام ایک خط مرقومہ جون، جولائی ۱۸۵۹ء میں لکھتے ہیں :

"نانا، نانی کے مرنے کا ذکر کیوں کر تے ہو۔وہ اپنی اجل سے مرے ہیں بزر گوں کا مرنا بنی آدمؑ کی میراث ہے۔" (۲۶)

موت کو بنی آدم کی میراث سمجھ کر قبول کرنے والے کے لیے موت کا شعور ہی اس کے خوف سے باز رکھ سکتا ہے۔غالب نے موت کو محض زندگی ہی کے حوالے سے نہیں دیکھا بلکہ اسے مادی زندگی کے انجام کے ساتھ ایک نئی تعمیر کا ابتدائیہ بھی سمجھا ہے۔جسم کی موت، غالب کے لیے فکر کی موت نہیں۔وہ فکری سطح پر بلندی پر منظر بنانے کے قائل ہیں۔لکھتے ہیں:

ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا (۲۷)

فرطِ اشتیاق نے غالب کی نیند متاثر کی ہے۔موت کے مقررہ وقت پر یقین غالب کے مذہبی ذہن کی علامت ہے۔دن اور رات کا آنا جانا بھی وقت کے تعین کا ایک پیمانہ ہے۔موت ، زندگی کا ایک ارتقا ہے اور اگر موت نہ ہو تو انسانی زندگی کا ارتقاءرک جائے گا اور زندگی جمود کا شکار ہو جائے گی۔

غالب خود کو موحد خالص کہتے ہیں۔ان کے یہاں عمل سے انحراف کے باوجود فکری سطح کا استقام موجود ہے۔اس کی توجہ حقِ بندگی کے ادا نہ کر سکنے کی حسرت پر ہے۔وہ مرنا چاہتے ہیں مگر اپنے آپ کو اس کے قابل بنا موت کے حوالے سے غالب کسی خوف یا طمع کا شکار نہیں ہیں۔اسی لیے کہتے ہیں :

جاں تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے [۲۸]

غالب نے ذاتی طور پر بھی اپنے سات شیر خوار بچوں کی مرگِ ناگہانی کا صدمہ سہا۔انہوں نے اپنی شاعری میں ظرافت کو زندگی سے نظریں چرانے کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ موت کے غم کا کتھارسز(Catharsis) کیا۔ان کے یہاں موت کے درد انگیز صدمات میں مزاح بھی ایک ردِ عمل کی صورت میں نمو دار ہو تا ہے۔

منشی ہر گو پال تفتہ کے نام ایک خط میں غالب لکھتے ہیں کہ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہو تا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کی زیست کیونکر دشوار ہو۔یہ سطور فرد کی موت پر غالب کے اجتماعی احساس کی نمائندگی بھی کرتی ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالی(۱۸۳۸ء ۔۱۹۱۴ء)

اُردو شاعری کے جذباتی رویوں میں تبدیلی کے جو آثار مرزا غالب کے ہاں پیدا ہوئے تھے ان کی تکمیل بہت حد تک مولانا حالی کے ہاں ہوئی۔اتفاق سے انہیں شاعری میں مرزا غالب سے شرفِ تلمذ تھا اور جدید تعلیمی اصلاحی تحریک کے حوالے سے سر سید اور ان کے مکتبہ فکر سے نسبت حاصل تھی۔صرف نسبت ہی نہیں وہ کئی اعتبار سے سر سید کی تحریک کے روحِ رواں بھی تھے۔نظم و نثر اور تنقید و سوانح میں حالی نے سب سے بڑھ کر نہ صرف سر سید کے نقطہ نظر کی بھرپور ترجمانی کی بلکہ اس میں علمی، ادبی اور تنقیدی اعتبار سے وسعت، لطافت ، محبت اور ہمدردی کے عناصر کا اضافہ کیا۔

حالی کی شاعری میں جہاں اعلیٰ اقدارِ حیات کی پامالی کا افسوس ملتا ہے وہاں عظمتِ رفتہ کی بحالی، عالی ہمتی اور استقلال کے ساتھ اپنے زورِ بازو پر یقین کی خواہش کا اظہار بھی ملتا ہے۔اپنی ذات پر بھروسہ حالی کے تصوّرِ حیات کی روحِ رواں ہے۔موت کی طرف بے توجہی اور غفلت کا اشارہ کر کے حالی نے موت کے یقین کو پختہ کر نے کی کوشش کی ہے۔

یقیں ہے کہ ہم جس کو سمجھے ہیں مرنا
یہی ہو تو ہو زندگانی کی صورت (۲۹)

حالی کا تصورِ موت ، زندگی سے نظریں چرا نے کے فرسودہ نظریے سے یکسر مختلف ہے۔اس میں کسی رہبانیت کا شائبہ تک نہیں۔یہ عملی زندگی کے لیے اصلاحی اور تعمیری بنیادیں فراہم کر تا ہے۔حالی ضعف و نا توانی (جو موت ہی کے زاویے ہیں)ا سے بھی کام لینا جانتے ہیں۔ملاحظہ فرمایئے:

پھر یہ بنائے ہستی ہے تیرے بعد ویراں
ہے تو بھی اب غنیمت اے ضعف و نا توانی (۳۰)

موت بر حق ہے، یہ نظریہ اپنے ساتھ ایک اور مثبت پہلو بھی لیے ہو ئے ہے کہ یہ انسان کے اندر بے خوفی کی صفت پیدا کر تا ہے۔حالی نے اس کااظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

نہ خوف مر نے سے جب تھا نہ اب ہے کچھ حالی
کچھ اک جھجک تھی سو وہ بھی نکلتی جا تی ہے (۳۱)

استعماری قوتوں کے سامنے دَبتی اور ڈوبتی ہوئی قوم کے لیے یہ نظریہ کسی طاقت سے کم نہیں۔۱۸۴۹ءمیں حالی کا دلّی سے لاہور آنا اور آخری عمر میں ہیضہ، چیچک ، بخار، تنہائی ا ور سراسیمگی کی حالت میں موت کے مظاہر کو جسم وجان پرواردہو تے دیکھنا اور محسوس کرنا بھی ایک اہم اور ذاتی تجربہ تھا۔اس ذاتی تجربہ نے صبر اور انتظار کا حوصلہ پیداکیا اور حیات بعد الموت کے عقیدے کو پختہ کیا۔لکھتے ہیں:

مانع گلگشت ہے بیم خزاں
موت کرتی ہے نگہبانی مری
قدر نعمت ہے بقدر انتظار
حشر پر ٹھہری ہے مہمانی مری (۳۲)

حالی کی اُردو غزل میں "جدائی "، "وداع " اور "رخصت" کے الفاظ موت ہی کے ہم معنی کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔زندگی کا ایک حصہ ختم ہونے کے بعد ملک بقا کی سرحد کا آغاز حالی نے ان الفاظ میں کیا ہے اور موت کو خاتمہ نہیں بلکہ دریائے حیات کا ساحل کہا ہے:

تجھ کو سمجھے تھے نعیم جاوداں
اے نعیم جاودانی الوداع
آلگا حالی کنارے پر جہاز
الوداع اے زندگانی الوداع
اے بہار زندگانی الوداع
اے شباب اے شادمانی الوداع
اے بیاض صبح پیری السلام
اے شب قدر جوانی الوداع
السلام اے قاصد ملک بقا
الوداع اے عمر فانی الوداع
فرصت عشق و جوانی الفراق
دور عیش و کامرانی الوداع (۳۳)

اکبر الہ آبادی (۱۸۴۶ء-۱۹۲۱ء)

زندگی کے بارے میں اکبر کی فکر و نظر کے زاویے متعین کرنے میں سیاسی و سماجی تبدیلیوں کے قدم بہ قدم مذہبی عقائد کی کارفرمائی اپنی تمام تر قطعیت کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔عالمِ رنگ و بو

میں انسان کی ہستی کا سوال ہو یا طرزِ زندگی کا انتخاب، اکبر خدا اور مذہب کو حاصلِ حیات قرار دیتے ہیں :

فقط اک ہستی اعلیٰ کا پر تو دل میں پڑتا ہے
جو کچھ اس کے سوا ہے وہم کی ہستی کا جھگڑا ہے (۳۴)

اکبر کے تصوّرِ حیات کی اصل ان کے تصور الٰہ میں ہے۔نیرنگی زمانہ میں انسان اپنے آپ کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو تا ہوا محسوس کر نے لگا۔ایسے میں انسانی ہستی کی نشو و نما اور وحدت کے لیے اکبر نے انسان کو ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف رجوع کر نے کی دعوت دی۔اکبر کا عقیدہ ہے کہ انسان کی ہستی کا وثوق اس کے خالق و مالک ہی سے ممکن ہے۔اُن کے خیال میں وقت بھی خدا کی ہستی کا ظہور ہے۔وہ کائنات کی روح ہے۔جس کے ادراک سے عقل قاصر ہے۔یہ نقطہ نظر طریق مغرب کی اس روشن ضمیری پر ایک ضرب بھی ہے جو خدا کو بھول کر محو ما سوا ہو رہے تھے۔اکبر زندگی کے تجربات سے گزر کر تفہیمِ حیات کے مرحلے تک پہنچ جاتے ہیں اور اس کی تکمیل کے لیے قرآن پاک کی تعلیم کو لازم قرار دیتے ہیں:

روح کا ہے امتحان اور زندگی کا کورس ہے
ہے مبارک وہ سمجھ قرآن جس کا سورس ہے (۳۵)

اکبر نے دنیاوی ترقی کے سیلاب کے آگے بند باندھنے کے لیے دین و دنیا میں توازن کی مثال قائم کی۔ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کے پاس نہ دین رہا اورنہ ہی دنیا اور ان کے لیے پنجرے میں پھدکتی مینا کی مثال چسپاں کی۔اِن حالات میں اکبر نے دین کا عمل فلسفہ پیش کر کے نظریاتی و عملی سطح پر آزادی اور قوت حاصل کی :

پھنسا ہوں زندگی میں سانس روکے رک نہیں سکتی
مگر دنیا کی خاطر میری گردن جھک نہیں سکتی (۳۶)

موت کے حوالے سے اکبر کی جو ڈکشن قابلِ ذکر ہیں، ان میں عہدِ الست ، ہوش ، بسمل، نزع اور دعا شامل ہیں۔اکبر کا کہنا ہے کہ عہد الست مذہب کی وہ مضبوط رسی ہے جسے تھام کر مسلمان ایک فرد یا قوم کی حیثیت سے بقا حاصل کر سکتا ہے۔اس عہد کو فراموش کر نے کا نتیجہ ہے کہ مسلم

قوم کی حالت، عالم نزع کی سی ہے۔نزع کا یہ عالم غفلت کی بے ہوشی کے مماثل ہے۔قوم اس عاشقِ غم زدہ کا نمونہ پیش کر رہی ہے جو عالم نزع میں دم بھر ٹھہر نے کی خواہش تو کر تا ہے مگر اس کی یہ آر زو تشنہ تکمیل نہیں ہو تی کیونکہ بظاہر مسیحائی کا دم بھر نے والے اپنے ساتھ قضا کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ایسے میں دعا کی اشد ضرورت ہے کہ اگلی منزل میں صرف خدا اور اس کا سہارا ہی کام آ نے والا ہے۔

اکبر کے تصورِ حیات کی طرح ان کے تصورِ ممات کی شاخیں مذہب، خدا اور آخرت کی اساس سے پھوٹتی ہیں۔موت پر تعجب اکبر کی نظر میں حماقت ہے۔ان کے نزدیک جبکہ موت کو عقل نہیں بلکہ روحانی قدروں کے پیمانے پر پر کھا جا سکتا ہے۔وہ آر زو ئے مرگ کی بنیاد خوفِ خدا پر رکھتا ہے اور جھنجھو ڑتا ہے کہ کیا موت کی آرزو کر نے والے اپنے گناہوں کی کثرت اور غفلت کے سبب اس اسلامی معیارِ صداقت پر پورا تر سکتے ہیں، جس سے گزر نے کے بعد ان کے لیے قبر تا حشر سر خروئی حاصل ہو سکتی ہے۔زندگی کے مقابلے میں موت سے بے خوفی کی اثباتی جہتیں اکبر نے یوں پیش کی ہیں:

اجل سے وہ ڈریں جینے کو جو اچھا سمجھتے ہیں
یہاں ہم چار دن کی زندگی کو کیا سمجھتے ہیں [۳۷]

موت سے کوئی نہ گھبرائے اگر یہ سمجھے!!
کہ یہ دنیا کے بکھیڑوں سے چھڑا دیتی ہے [۳۸]

اجل کو دیکھ کے زیرِ فلک قرار آیا
مصیبتوں کی بالآخر اک انتہا ہے تو [۳۹]

عقبیٰ کا یقیں تجھ کو نہ ہوتا جو کم اتنا
دنیا کے حوادث یہ نہ ہوتا الم اتنا [۴۰]

اکبر نے اپنے مخصوص طنزیہ پیرائے میں ان لوگوں کی منافقت کا پر دہ چاک کیا ہے جو زبان سے موت کی آرزو تو کر تے ہیں مگر عملاً جہاد کے نام سے بدکتے ہیں۔وہ موت کے ثمرات سے تو لطف اٹھانا چاہتے ہیں مگر موت کے عمل سے گزرنا نہیں چاہتے۔

موت سے ڈرتا ہوں مگر موت کا شائق بھی ہوں
یعنی شبہ ہے کہ ایسے شوق کے لائق بھی ہوں (۴۱)

اکبر موت کا ایک اثباتی زاویہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ وہ زندگی کی تمام تر پیچیدگیوں کا حل ہے اور حیات کی بدنصیبی کی تلافی کی توقع بھی موت سے وابستہ کی جا سکتی ہے۔اکبر کی نگاہ اس مستقبل پر ہے جو موت ہی کی ایک صورت ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اقبال مندی کے دن بھی ختم ہو جائیں گے اس لیے یوم احتساب کا خیال رکھا جائے۔سارے عالم میں طاقت، توانائی اور غرور کا انجام ایک ہی ہو تا ہے۔وہ لوگ جو خود موت کے سامان پیدا کر رہے ہیں وہ بھی اس کی زد میں ہیں:

ہو رہا ہے نفاذ حکمِ فنا!!!
نہ مکیں اس سے بچتے ہیں نہ مکان
توپیں خود آ کے اب تو میداں میں
کہتی ہیں کل من علیھا فان (۴۲)

اکبر کے ہاں موت کا ایک عارفانہ تصوّر موجود ہے۔ان کے ہاں دنیا سے جدائی، باعث رنج نہیں ہے کیونکہ معشوقِ حقیقی سے امیدِ وصل ہے۔اسی لیے نزع اور سکرات کی تکالیف نہ صرف گوارا بلکہ باعث مسرت ہیں۔نزع کی بے چینی بھی محبوبِ حقیقی سے ملنے کا ایک امتحان ہے۔لکھتے ہیں:

مشتاق حق کے واسطے نعمت کا ڈھیر ہے
بس زندگی حجاب ہے مرنے کی دیر ہے (۴۳)

موت، ایک راز ہے مگر مومن کے لیے اس میں دل نشینی اور کشش اسی لیے ہے کہ مرنے کے بعد وہ حق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کی امید و راحت کی بے شمار نعمتوں سے فیض یاب ہو گا۔ اکبر کا کہنا ہے کہ:

ہے موت میں ضرور کوئی راز دل نشین
سب کچھ کے بعد کچھ بھی نہیں یہ تو کچھ نہیں (۴۴)

شانِ کریمی سے یہ بعید ہے کہ وہ انسان کو کچھ دے کر چھین لے۔اس خوش اعتقادی کا اظہار اکبر نے یوں کیا ہے :

کسی کے مرنے سے یہ نہ سمجھو کہ جان واپس نہیں ملے گی
بعید شان کریم سے ہے کہ کسی کو کچھ دے کے چھین لینا (۴۵)

اکبر روح کی ترقی کے قائل بھی ہیں اور تسلسل کے بھی۔اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ روح معدوم نہیں ہوتی۔اکبر کا عقیدہ ہے کہ روح کو بقا ہے مگر انسان کی آنکھ دیکھنے سے قاصر ہے:

جسم تو خاک میں مل جاتے ہوئے دیکھے ہیں
روح کیا جانے کدھر جاتی ہے کیا ہوتی ہے (۴۶)

بقا اور تحفظ کی تمام تر کوششوں کے باوجود ہر چیز کو فنا ہے، یہ عام قاعدہ ہے لیکن اکبر کا کہنا ہے کہ **ان اللّٰہ علیٰ کل شیءقدیر** کے درست مفہوم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔اس کی وضاحت ایک خط میں یوں کی ہے :

> "یہ فلسفہ کہ وجود در حقیقت ذہن ہی میں ہے علم باری میں ہے اور علم باری ہی سب کچھ ہے۔ایسا صحیح فلسفہ ہے کہ میں اس کو **کل من علیھا فانo و یبقیٰ وجه ربک ذو الجلال و الاکرام** کی ایک صوفیانہ تفسیر سمجھ سکتا ہوں۔ کل من علیھا فان میں لفظ فنا سے ظاہراً یہی سمجھا جاتا ہے کہ بالآخر ہر شے کو فنا ہے لیکن ذہن کہتا ہے کہ بالآخر کیسا۔جب غور کرو اور حقیقت پر نظر ڈالو۔تو کل پر فنا حاوی ہو جاتی ہے۔صرف علم باری رہ جاتا ہے۔ہمہ اوست یہیں سے ہے۔" (۴۷)

اکبر کی شاعری میں خاموشی اور سکوت کے الفاظ اگر ایک طرف ناتوانی اور بے دلی کے اشارے ہیں تو دوسری جانب ضبط اور امن کے استعارے بھی ہیں۔خاموشی وقت کی ضرورت ہے مگر سکوت، زندگی کی شرط ہے۔اکبر کے عہد میں حکمران قوم کے تناظر میں خاموشی کا پس منظر لیے ہوئے، موت ، حق پرستی کا واحد راستہ بن جاتی ہے۔اس اعتبار سے سیاسی حالات کے جبر اور ساز گاری میں موت کا سکوت بھی مومن صفت کے لیے اُمید کی ایک روشنی ہے:

حکم آیا خموشی کا تو بس حشر تلک چھپ
عظمت ترے پیغام کی ظاہر ہے اجل سے (۴۸)

میر ، غالب ، حالی اور اکبر کی شاعری کے تناظر میں موت کا جو تصور ابھر تاہے وہ ان شعرا کے یہاں الگ الگ ہو نے کے باوجود ایک بنیادی تصوّر سے مر بوط ہے جس میں انسان موت میں زند گی کے آثار کی نمود دیکھتا ہے۔اور اس کے دامن میں پناہ حاصل کر نے کی خواہش سے دل کے اضطراب کا مداوا کر تا ہے۔یہ سب شعرا میر کی ہم نوائی میں اس بات کے قائل ہیں کہ :

موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

حوالہ جات

۱۔ خالد علوی ،غزل کے جدےد رجحانات،اے جو کے نشنل پبلشنگ ہاؤس ، دہلی،۱۹۹۲ء، ص ۱۲۰

۲۔ صائمہ شمس،ڈاکٹر،اردو غزل میں مرگ و حیات کا تصور،ادارہ فروغِ قومی زبان،پاکستان ، ۲۰۱۲ء، ص۱۴۱

۳۔ نثاراحمد فاروقی،مطالعہ میر کے امکانات،مشمولہ: تلاشِ میر،انجمن ترقی اردو ہند،نئ دہلی،۱۹۹۴ء، ص۶۰

۴۔ آل احمد سرور ،میر کے مطالعہ کی اہمیت،مشمولہ: افکارِ میر،مرتبہ:ایم حبیب خاں، عبدالحق اکیڈمی ، دہلی،۱۹۹۶ء، ص۱۵۷

۵۔ محمد تقی میر،ذکرِ میر،مرتبہ:ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، مجلسِ ترقی، ادب،لاہور،۱۹۹۴ء، ص۵۵

۶۔ محمد تقی میر،کلیاتِ میر ،دیوان چہارم،جلد سوم،مقبول اکیڈمی،لاہور،۱۹۹۷ء،ص۳۲۹

۷۔ کلیاتِ میر ،دیوان ششم،جلد چہارم،ص۲۲۴

۸۔ کلیاتِ میر ،دیوان اوّل،ص۲۵۱

۹۔ کلیاتِ میر، دیوان سوم، ص ۳۷۱

۱۰۔ ایضاً ، ص۷۶

۱۱۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر،کلامِ میر میں فکری عناصر،مشمولہ: نقدِ میر، مقبول اکیڈمی، لاہور،۱۹۹۹ء، ص۱۲۷-۱۲۸

۱۲۔ کلیاتِ میر ،دیوان سوم،ص۱۷۱

۱۳۔ کلیاتِ میر ،دیوان اوّل،ص۲۳

۱۴۔ کلیاتِ میر ،دیوان سوم،ص۴۷

۱۵۔ سمیع اللہ قریشی،پروفیسر،غالب کی نفسیاتِ غم ،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۱ء،ص۱۷

۱۶۔ اسداللہ خاں غالب،دیوانِ غالب،سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۷ء،ص۱۲

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۴۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۵۷

۱۹۔ ایضاً، ص۱۸۴

۲۰۔ ایضاً، ص۲۱۵

۲۱۔ سید وحیدالدین،غالب کا حسن فکر اور حقیقت آگہی،مشمولہ: غالب کے جدید تنقیدی تناظرات ، مرتبہ: اسلوب احمد انصاری ، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی،۲۰۰۴ء،ص۵۴

۲۲۔ دیوانِ غالب،ص۱۴

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۷

۲۴۔ ایضاً،ص۲۵۴

۲۵۔ میاں محمد رفیق خاور،غالب ایک نیا تصور،مشمولہ: راوی ،جلد ۴۳،۱۹۵۰ء،ص۲۸

۲۶۔　اسداللہ خاں غالب،مکتوب بنام یوسف مرزا،مشمولہ: غالب کے خطوط،مرتبہ:خلیق انجم، جلد دوم،غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی،۱۸۸۹ء،ص۶۸۷

۲۷۔　دیوانِ غالب،ص۱۹

۲۸۔　ایضاً،ص۱۸۶

۲۹۔　الطاف حسین حالی،دیوانِ حالی،اردو اکیڈمی،کراچی،س۔ن،ص۷۱

۳۰۔　ایضاً، ص۱۰۹

۳۱۔　ایضاً ص۱۱۱

۳۲۔　ایضاً ، ص۱۱۵

۳۳۔　ایضاً ، ص ۸۹

۳۴۔　اکبرالہ آبادی ،کلیاتِ اکبر،حصہ اوّل،یونین پرنٹنگ پریس،دہلی،س۔ن،ص۳۶

۳۵۔　ایضاً، ص۳۷

۳۶۔　اکبرالہ آبادی،کلیاتِ اکبر،حصہ سوم،ادبی پریس،لکھنو،س۔ن،ص۸۶

۳۷۔　کلیاتِ اکبر، حصہ اول،ص۸

۳۸۔　ایضاً، ص ۱۲

۳۹۔　ایضاً، ص ۵۴

۴۰۔　کلیاتِ اکبر،حصہ سوم،ص۱۵

۴۱۔　ایضاً، ص ۴۲

۴۲۔　ایضاً، ص۴۷

۴۳۔　ایضاً ، ص۷۶

۴۴۔　ایضاً ، ص ۴۶

۴۵۔ ایضاً، ص ۳

۴۶۔ ایضاً، ص ٦٦

۴۷۔ اکبرالہ آبادی، خطوطِ مشاہیر ،مرتبہ:عبدالماجد دریا آبادی، تاج کمپنی، لاہور، س۔ن، ص۵۲

۴۸۔ کلیاتِ اکبر، حصہ سوم ،ص۱۶۹